ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

ثقافت

(پاکستان اورنٹیل کانفرنس کے شعبۂ ثقافت کا صدارتی خطبہ جو ۳۰ دسمبر ۱۹۵۲ء کو اورنٹیل کالج لاہور میں پڑھا گیا تھا۔)

حکیم سقراط کا طریق بحث یہ تھا کہ سب سے پہلے موضوع زیر بحث میں جو اصطلاح استعمال ہو اس کی تعریف وتحدید کی جائے جو واضح اور جامع و مانع ہو۔ یعنی اس کے مفہوم میں جو کچھ آتا ہے یا آنا چاہیئے وہ اس تعریف میں آجائے اور جو صفت اس سے خارج ہو وہ اس کے اندر آنے نہ پائے۔ منطقی طور پر یہ شرط عائد کرنا تو آسان ہے لیکن اس شرط کے مطابق کسی موضوع کو متعیّن اور مشخص کرنا نہایت دشوار امر ہے۔ اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ گدھے اور گھوڑے کا فرق اس طرح بتاؤ کہ بیّن طور پر ان کے صفات و اعمال متمائز ہوسکیں تو غالباً یہ علمی محفل بھی ایک عقلی اور منطقی چکّر میں آجائے اور آخر میں شاید یہی کہنے لگیں کہ تعریف و تحدید برطرف جس نے بھی گدھوں اور گھوڑوں کو دیکھا ہے وہ ان کے پہچاننے میں غلطی نہیں کرسکتا اور پھر کوئی پوچھے کہ اچھا خچر کی نسبت کیا کہا جائے جو گدھے اور گھوڑے کی آمیختہ نسل ہے۔ وہ نہ گدھا ہے اور نہ گھوڑا، اور دو تو انواع کے بہت سے ظاہری اور باطنی صفات اس میں پائے جاتے ہیں، تو فرقِ صفات اور امتیازی خصوصیات اور بھی زیادہ مشوّش ہو جاتے۔ جرمن زبان میں ایک مثل ہے کہ خچر سے اس کے باپ کی نسبت دریافت کیا گیا تو چونکہ وہ پدری رابطے کو باعثِ توہین اور مادری رشتے کو موجبِ توقیر سمجھتا تھا اس نے اصل جواب سے پہلو بچا کر سوال کرنے والے سے کہا کہ کیا تم میرے ماموں کو نہیں جانتے۔ اس مثل کو علامہ اقبال نے بھی اشعار کا جامہ پہنا دیا ہے۔

حیاتِ انسانی کے بعض موضوع ایسے ہیں کہ لوگ انہیں اس قدر واضح اور بدیہی سمجھتے ہیں کہ ان کے مفہوم کے تعیّن کی کچھ ضرورت نہیں سمجھتے۔ ہر شخص فطرتاً حسن پرست واقع ہوا ہے لیکن اگر کسی بڑے شاعر یا فلسفی سے بھی پوچھا جائے کہ حسن کیا چیز ہے اور کسی چیز یا کسی شخص کو حسین کہنے کے لئے کن شرائط کا ہونا لازمی ہے تو دل و دماغ بے حد اُلجھن میں پڑ جائیں گے۔ جمالیات کے ماہرین نے درجنوں کتابیں اس پر لکھ ڈالی ہیں لیکن معاملہ جہاں تھا وہیں رہا۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ خدا سے بھی اس کی نسبت سوال کیا گیا تو ایک مختصر سا غیر تشفی بخش جواب ہی ملا:

خدا سے حُسن نے اک روز یہ سوال کیا | جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دُنیا | شبِ درازِ عدم کا فسانہ ہے دُنیا
ہوئی ہے جب کہ تغیّر سے ہی نمود اسکی | حسیں وہی ہے حقیقت زوال ہے جس کی

اب آپ ہی دیکھئے کہ محض زوال پذیر ہونا فقط حسن ہی کی صفت تو نہیں، دنیا و مافیہا میں جو کچھ بھی ہے وہ زوال پذیر ہے۔ جس طرح حُسن زوال پذیر ہے اسی طرح بد صورتی بھی زوال پذیر ہے۔ آج تک حُسن کی جتنی تعریفیں کی گئی ہیں ان میں سے کسی کا اطلاق ہر حسین چیز پر نہیں ہوتا۔ اگر آپ مصوّروں سے یا نقادانِ فن سے پوچھیں کہ تصویر میں حُسن کہاں سے آتا ہے اور اس کے مرتبہ حُسن کو جانچنے کا کیا معیار ہے تو بحث میں ایسا اُلجھاؤ پیدا ہو کہ ماہرین میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کا ہم آہنگ نہ بن سکے۔ حُسن کا حریف جسے عشق کہتے ہیں اس کا بھی یہی حال ہے۔ محبت کسے کہتے ہیں۔ سچی محبت اور جھوٹی محبت میں کیا فرق ہے۔ عشق اور ہوس میں کس طرح امتیاز کر سکتے ہیں۔ محبت جنون ہے یا عقل کی معراج۔ والدین کی اولاد سے محبّت اور بچّے کی ماں سے محبّت میں کیا فرق ہے عشق اکسیرِ حیات ہے یا وہ خود ایک بیماری ہے یا بقول مولانا حالی بیکاروں کا ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ عشق و محبت کی نسبت ہزاروں باتیں کہی گئی ہیں اور سب کے اندر کچھ نہ کچھ سچائی ہے۔ لیکن مسئلہ صاف نہیں ہُوا اور نہ ہوگا۔ محبّت کی نسبت ابھی تک سوچنے والے یہی کہہ رہے ہیں کہ شاید وہ اس صفت کا نام ہے یا شاید اس صفت کا۔ غرضیکہ معاملہ شاید سے آگے بڑھتا نظر نہیں آتا :

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہؔ | اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

اب آپ شاید دل میں یہ سوچنے لگے ہیں کہ ثقافت کی بحث میں ہیں یہ فلسفی خواہ مخواہ کبھی گدھوں، گھوڑوں اور خچروں کے اصطبل میں لے جا رہا ہے اور کبھی حسن و عشق کا ساز چھیڑ رہا ہے۔ سیدھی طرح یہ کیوں نہیں بتاتا کہ ثقافت سے کیا مراد ہے۔ اسلامی ثقافت کیا ہے اور مسلمانوں کی ثقافت کے امتیازی خصوصیات کیا ہیں؟ حضرت ایک ادارے کے ناظم ہیں جس کا نام ہے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، اور ایک رسالے کے ایڈیٹر ہیں جس کا نام ہے "ثقافت"، سب سے زیادہ بیّن طور پر تو ثقافت کا مفہوم ثقافت کے ناظم و مدیر پر واضح ہونا چاہیئے۔ لیکن حضرات آپ کو اس بارے میں مایوس ہونا پڑے گا۔ طبیعی اور ریاضیاتی علوم تو آپ کو اتقان و یقین کے ساتھ عناصر کے کون و فساد اور تغیرات کے قانون بتا سکتے ہیں۔ اور تجربہ گاہوں میں تحقیقات کو پرکھ سکتے ہیں۔ لیکن جس سوچنے والے کا موضوع عام زندگی یا مخصوص طور پر انسانی زندگی ہے اس کی کوششیں حیرت سے شروع ہو کر آخر میں پھر

حیرت ہی میں ختم ہو جاتی ہیں:

کاملے گفت است می باید بسے　　عقل و حکمت تا شود گویا کسے
بار باید عقل بے حد و شمار　　تا شود خاموش یک حکمت شعار

یہ تمہید میں نے اس لئے اُٹھائی ہے کہ آپ مجھ سے کوئی غلط اُمیدیں وابستہ نہ کرلیں اور آخر میں مایوس ہوکر یہ گلہ نہ کرنے لگیں کہ اس مرد سخن ساز نے سوال تو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالے ہیں، لیکن جواب کے وقت کترا کر نکل گیا ہے۔

اب آئیے اصل موضوع سے دست و گریبان ہوں۔

ثقافت عربی کا لفظ ہے اور اب اُردو میں یہ لفظ کوئی پچیس تیس سال سے استعمال ہونے لگا ہے۔ اب بھی اس کا استعمال عام نہیں۔ تہذیب اور تمدّن کے الفاظ سے تو ہر شخص آشنا ہے لیکن ثقافت کے متعلق مجھ سے بارہا پڑھے لکھے لوگوں نے بھی سوال کیا ہے کہ یہ کیا چیز ہے۔ سر تیج بہادر سپرو، جو اُردو کے عاشقوں میں سے تھے اور ان کا فارسی کا ذوق بھی عام سطح سے زیادہ بلند تھا، عثمانیہ یونیورسٹی میں جلسۂ تقسیم اسناد میں خطبہ پڑھنے حیدرآباد تشریف لائے۔ گھر سے انگریزی میں خطبہ لکھ کر لائے تھے۔ جب ان سے تقاضا ہوا کہ خطبہ اُردو میں پڑھنا ہوگا تو ترجمے کی زحمت سے بچنے کے لئے اُنہوں نے مجھ سے مدد چاہی۔ میں نے کلچر کا ترجمہ ثقافت کیا تو پوچھنے لگے کہ بھائی یہ کیا چیز ہے؟ میں نے عرض کیا کہ پہلے تہذیب اور تمدّن کے الفاظ استعمال ہوتے تھے اب ثقافت کا لفظ علمی تحریروں میں استعمال ہونے لگا ہے۔ کیونکہ یہ لفظ تہذیب اور تمدّن دونو پر حاوی ہے۔ مجھ پر اعتبار کرکے اُنہوں نے خطبے میں یہی لفظ استعمال کیا جو ان کے وسیع مطالعہ کے باوجود ان کی نظر سے نہ گزرا تھا۔

بلحاظ مادہ کسی لفظ کے معنی نہایت سادہ ہوتے ہیں لیکن جب وہ لفظ اصطلاح کے طور پر استعمال ہونے لگے تو اس کے مفہوم میں بڑی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ ثقافت کا عربی سہ حرفی مادہ ثقف ہے جس کے معنی ہیں درست کرنا، سنوارنا اور بل نکالنا۔ چنانچہ تیر کو آگ میں تپا کر سیدھا کرنے کو تثقیف کہتے ہیں:

اقبال عشق نے مرے سب بل دیئے نکال　　مدّت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

عشق نے اقبال پر جو عمل کیا اسے آپ ان معنوں میں بے دریغ تثقیف کہہ سکتے ہیں۔ میں عرض کرچکا ہوں کہ اس کے مقابلے میں ہمارے ہاں تہذیب و تمدّن کے الفاظ زیادہ مستعمل ہیں۔ جو انگریزی الفاظ کلچر اور سوبلیزیشن کے مرادف ہیں۔ جس طرح ہمارے ہاں تہذیب و تمدّن کی بحثوں میں خلط

مبحث ہے۔ یہی حال انگریزی کلچر اور سویلیزیشن کا ہے۔ کوئی لکھنے والا کلچر کو ایسے وسیع معنوں میں استعمال کرتا ہے کہ سویلیزیشن کا مفہوم بھی اس میں آجاتا ہے۔ اور کوئی سویلیزیشن کے مفہوم میں کلچر کے مفہوم کو بھی لپیٹ لیتا ہے۔ ہم نے جو ثقافت کی اصطلاح اختیار کر لی ہے تو اس میں ایک فائدہ ہے اور ایک نقصان ہے۔ فائدہ یہ ہے کہ ایک ہی لفظ تہذیب اور تمدّن دونو پر محیط ہو جاتا ہے۔ اور نقصان یہ ہے تہذیب و تمدّن کا امتیاز، جو میرے نزدیک لازمی ہے اور جس کا قائم رکھنا خلط مبحث سے بچنے کے لئے ضروری ہے، ثقافت کے لفظ کے اندر مبہم ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کے اندر تہذیب و تمدّن کی بحث دین کو شامل کر کے اور بھی زیادہ ژولیدہ ہو جاتی ہے۔ مسلمان کے نزدیک اس کا دین تمام زندگی پر حاوی ہے۔ یا زندگی کے تمام شعبوں پر اسے حاوی ہونا چاہیئے، اور تکمیلِ دین میں سبھی کچھ آجاتا ہے۔ عربی زبان میں اور اسلام کے اندر دین کا مفہوم بڑا وسیع ہے۔ اس کے مفہوم میں اصولِ زندگی بھی ہیں اور طرزِ زندگی بھی جس کے لئے آج کل انگریزی میں WAY OF LIFE کی اصطلاح زیادہ رائج ہو گئی ہے۔ اب قومیں جنگ کرتی ہیں تو دین یا کلچر یا مال و جان کی حفاظت کا نام نہیں لیتیں بلکہ یہ اعلان کرتی ہیں کہ ہم اپنے WAY OF LIFE کو دشمن سے بچانا چاہتے ہیں۔

طلوعِ اسلام کے دَور میں جب رسولِ کریمؐ اور ان کے ساتھیوں کو اپنے دفاع کے لئے جنگیں لڑنی پڑیں تو وہ کہتے تھے کہ ہم دین کی حفاظت کے لئے لڑتے ہیں۔ اور دین کی حفاظت کا مفہوم ان کے نزدیک صرف اپنے مخصوص دین کا بچاؤ نہ تھا بلکہ عام آزادیِ ضمیر تھی۔ مقصد یہ تھا کہ ہم ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں ہر شخص اور ہر ملّت بے کھٹکے اپنے عقاید اور اپنے طریق پر زندگی بسر کر سکے۔ "لا اکراہ فی الدین" میں ہر شعص کا دین شامل تھا۔ اور دین میں وہ سب کچھ داخل تھا جسے آج کل یا کلچر کہتے ہیں یا WAY OF LIFE۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تمام اقوامِ اسلام کا اگر دین ایک ہے تو اس کا طرزِ زندگی بھی ایک ہونا چاہیئے۔ اس سوال کا جواب ذرا تفصیل سے دینے کی ضرورت ہے۔ اسلام سے قبل اکثر ظواہر و شعائر میں رسولِ کریمؐ کا اور ان کے پیروؤں کا جو بعد میں رفتہ رفتہ اسلام میں داخل ہوئے ایک طرزِ زندگی تھا۔ انفرادی طور پر ہر فرد کی زندگی دوسرے افراد سے کم و بیش مختلف ہوتی ہے لیکن ایک قوم کے لوگوں میں بہت کچھ مشترک بھی ہو سکتا ہے۔ ان کے لباس میں بہت یکسانی ہوتی ہے۔ ان کی خوراک میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان کی پوشش، ان کی رہائش، ان کے مکان اور رسم و رواج کی بہت سی چیزیں باہم ہم رنگ اور دیگر اقوام سے متمائز ہوتی ہیں۔ بہت سے طریقے

معاشی وسائل کی پیداوار ہوتے ہیں اور بہت سی چیزیں آب وہوا اور عام جغرافیائی ماحول سے تعلق رکھتی ہیں۔ جب نبی کریمؐ جیسا ایک انقلابی مصلح اعظم آتا ہے تو بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ لیکن سب کچھ نہیں بدلتا۔ اور نہ ہی ایسا مصلح حکیم یہ کوشش کرتا ہے کہ خواہ مخواہ ہر چیز کو بدل ڈالے۔ اس لحاظ سے نبی کی زندگی کے بھی دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک قومی پہلو ہوتا ہے جس میں وہ اپنی قوم کا ایک فرد ہوتا ہے۔ وہ قوم کی بولی بولتا ہے۔ اپنی قوم کا لباس پہنتا ہے۔ اس کا گھر بھی دوسروں کے گھروں کی طرح ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مخصوص قومی مزاج کے بھی بہت سے عناصر اس کے اندر ہوتے ہیں جن کو بدلنے کی اس کو کوئی خاص ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ قوم کی اصلاح بھی وہ قوم کے مزاج اور اس کے حالات کو مدِّنظر رکھ کر کرتا ہے۔ بعض باتیں اس کو اپنے نزدیک مناسب معلوم ہوتی ہیں لیکن قوم کے مزاج کو زیادہ ٹھیس نہیں لگانا چاہتا اس لئے وہ ایسی تبدیلی پر مصِرّ نہیں ہوتا۔ صحیح بخاری میں ایک حدیث ہے کہ رسولِ کریمؐ نے فرمایا کہ اگر قوم کے جذبات کو ٹھوکر لگانے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں کعبے کی تعمیر میں ایسی تبدیلی کرتا جو اصل ابراہیمی نقشے کے مطابق ہوتی۔ میرا مطلب اس بیان سے یہ ہے کہ اگرچہ دینِ اسلام ایک واحد نظریۂ عبادت کا نام ہے لیکن آغازِ اسلام میں حجاز کی زندگی سے باہر آنے کے قبل بھی مسلمانوں کے طریقِ زندگی میں سب کے سب عناصر اسلامی نہ تھے۔ شاہ ولی اللہؒ نے اس موضوع پر کہ نبی کی زندگی کا ایک قومی پہلو بھی ہوتا ہے جو تمام اقوام اور تمام ادوار پر لازماً قابلِ تقلید نہیں ہوتا، نہایت حکیمانہ بحث کی ہے۔ اب سوچیئے کہ تکمیلِ دین کے کیا معنی ہیں اور دین سے مسلمانوں کو کیا مفہوم لینا چاہیئے۔ از روئے قرآن دین کی اصل عقیدۂ توحید اور مکافاتِ عمل ہے۔ اسلام کے اساسی عقائد کچھ اخلاقی اور روحانی اقدار ہیں جن کو محفوظ رکھنے کے لئے کچھ شعائر کی تلقین ہے۔ اخلاقی اقدار میں انفرادی اخلاقیات بھی آجاتی ہیں اور افراد اور ملل کے باہمی روابط بھی، جن کی نسبت بنیادی اصول قرآن میں اور تلقین اُسوۂ رسول میں موجود ہیں۔ حیاتِ انسانی ایک تغیر پذیر اور ارتقاء کوش حقیقت ہے۔ لہٰذا اسلامی ثقافت یا مسلمانوں کی ثقافت ہمیشہ کسی ایک نقشے پر قائم نہیں رہ سکتی۔ رسولِ کریمؐ نے فرمایا کہ جس شخص کے دو دن یکساں ہوں، یعنی جس نے کل کے مقابلے میں آج کوئی ترقی نہیں کی، وہ شخص گھاٹے میں ہے۔ (من استواء یومین فھو مغبون۔) یہی حال اقوام کا ہے۔ قومیں جب تہذیب و تمدّن میں آگے نہیں بڑھتیں تو یا پیچھے ہٹنے لگتی ہیں یا جامد ہو جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جن اقوام میں حرکت ہوتی ہے ان میں حرکت، برکت اور قوت پیدا کرتی ہے۔ جس کی بدولت وہ پس ماندہ اور جامد اقوام پر غالب آجاتی ہیں۔ مغلوب اقوام کی دنیا اور دین دونوں کو بیک وقت زوال آتا ہے۔

حجاز کا تمدّن زیادہ تر قبیلوی تمدّن تھا۔ بہت سے حصّے کی زندگی بدوی زندگی تھی جو تمدّن کے لحاظ سے نہایت پست ہوتی ہے۔ اس بدوی اور قبیلوی زندگی میں خصائلِ حسنہ کے ساتھ ساتھ بعض نہایت مذموم روایات و عادات بھی پائے جاتے ہیں اسی لئے رسولِ کریمؐ نے فرمایا "الاعراب اشد کفراً ونفاقاً" لبِ لباب یہ ہے کہ اسلام کا زاویۂ نگاہ زندگی کی نسبت نہایت صالح اور بلند تھا۔ اس نے اچھے رجحانات پیدا کئے جو تہذیب و تمدّن میں رنگا رنگ کے گل و ثمر پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ رجحانات نہایت جاندار اور نشو پذیر تخم تھے جن کو نخل بننے کے لئے معاشی حالات کی زرخیز زمین درکار ہے۔ قرآن کی وحی "اقراء" سے شروع ہوتی ہے اور یہ حکم ایسے شخص کو ہوا جو خود پڑھ نہ سکتا تھا۔ خدا کی مشیت یہ کہہ رہی تھی کہ تجھے تو امی ہونے کے باوجود حکمت سے مالا مال کر دیا گیا ہے۔ بقول حافظ:

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست کتب خانۂ ہفت ملّت بشست

نگارِ ما کہ بہ مکتب نہ رفت و خط نہ نوشت بغمزہ مسئلہ آموزِ صد مدرس شد

لیکن تیری اُمت کو دوسری قوموں کے مقابلے میں زیادہ پڑھنا لکھنا چاہئے۔ اس "اقراء" کے ساتھ علم بالقلم بھی ہے۔ قرآن کی ایک دوسری صورت میں قلم کی قسم بھی موجود ہے۔ اس تلقین کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان سب سے زیادہ پڑھنے لکھنے والی قوم بن گئے۔ رسولِ کریمؐ نے ناخواندہ لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھانا اسیرانِ جنگ کا فدیہ قرار دیا۔ خود قرآن کے معنی پڑھنے کے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان دنیا کے علوم و فنون پر پل پڑے۔ قرآن سے پہلے تمام عرب میں کوئی کتاب نہ تھی دیکھتے دیکھتے تمام اُمت کتاب خوانوں کا ایک متوالا گروہ بن گئی۔ لیکن نافہم لوگ مسلمانوں اور اسلام کی تحقیر کے مذموم جذبے کے ماتحت یہ کہتے رہتے ہیں کہ اصل اسلام میں کیا رکھا ہے اور آغازِ اسلام میں مسلمانوں کے پاس علوم و فنون اور تہذیب و تمدّن کا کچھ سرمایہ نہ تھا۔ اُنہوں نے جو کچھ لیا وہ دوسروں سے لیا۔ یہ ایسی ہی احمقانہ بات ہے کہ کوئی شخص کسی نخل میوہ دار کے بیج کو دیکھ کر کہے کہ اس تخم حقیر میں کیا رکھا تھا۔ درخت نے جو کچھ لیا وہ مٹی سے لیا، پانی سے لیا اور سورج کی کرنوں سے اخذ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جمادات کے ان تمام عناصر کو اسی ایک چھوٹے سے بیج نے حسین و جمیل اور حیات پرور زندگی میں تبدیل کر دیا۔ دیگر اقوام میں علوم و فنون کا بے شمار خام مواد موجود تھا اور بہت سے کمالات جا بجا منتشر تھے لیکن چونکہ ان اقوام کی نفسی اور روحانی زندگی مفلوج ہو چکی تھی ان کے معلومات زندگی کی تعمیر میں کام آنے کی بجائے ان کی تخریب کا باعث بن رہے تھے۔

اسلام چند صدیوں میں دُنیا کی بیشتر متمدّن اقوام میں پھیل گیا اور ہر جگہ اس کو مخصوص حالات

سے دوچار ہونا پڑا۔ عجمی اقوام کا مزاج عربی نہ تھا اور نہ ان کا تمدّن عربی تھا۔ جس طرح طلوع اسلام کے ابدی حقائق کی آمیزش عربی مزاج سے ہوئی اور ایک مخصوص قسم کا مرکب ظہور میں آیا اسی طرح شام میں، مصر میں، ایران میں، چین میں، ہندوستان میں اور بے شمار دیگر ممالک میں اس نے وہاں کے حالات اور مزاج میں اپنے آپ کو سمویا تو ہر جگہ مسلمانوں کی زندگی میں اسلام کے کلّی حقائق کے ساتھ دیگر اقوام کے عادات واطوار اور میلانات کی آمیزش ہوتی چلی گئی۔ اس آمیزش میں کچھ عناصر صالح تھے اور کچھ غیر صالح۔ بعض جگہ نتائج اچھے نکلے اور بقول علامہ اقبال عرب کے سوزِ دروں نے عجم کے حسنِ طبیعت کے ساتھ مل کر انسانی اقدار کو جدید اور دل کش انداز میں جلوہ گر کیا۔ حافظ اور سعدی، رومی اور عطار اور سنائی اور بے شمار حکماء اور ادیب ایسے ہیں جو ان افکار، ان حالات اور میلانات کی بدولت پیدا ہوئے جو حجاز میں نہ تب موجود ہو سکتے تھے اور نہ اب پائے جاتے ہیں۔

ہم تہذیب اور تمدّن یعنی کلچر اور سویلیزیشن پر پہلے الگ الگ نظر ڈالتے ہیں اور اس کے بعد دیکھیں گے کہ ان کا باہمی تعلق کس قسم کا ہے۔ کیا ایک کی ترقی سے دوسرے کی ترقی لازم آتی ہے۔ کیا ایک کا دوسرے کے بغیر وجود ممکن ہے، یا ایک کی ترقی دوسرے کے منافی ہے۔ پہلے اس سوال کے جواب کی کوشش کرنی چاہیئے کہ تہذیب سے کیا مراد ہے۔ اور مہذّب انسان کسے کہتے ہیں۔ اس سوال کے ساتھ یہ سوال بھی اُبھرتا ہے کہ کیا مختلف ادوار اور مختلف اقوام کی تہذیبیں الگ الگ ہوتی ہیں یا تہذیب انسانی کا فقط ایک واحد نصب العین ہے۔ اور مختلف اقوام کے درجۂ حیات کا اس سے اندازہ کرنا چاہیئے کہ کوئی قوم کس قدر اس نصب العین سے نزدیک یا دور ہے۔ اور جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں اس تمام مبحث میں دینی عقائد کو بھی علیحدہ نہیں کر سکتے کیونکہ مختلف تہذیبیں مختلف ادیان کی پیدا وار ہیں، یا دینی عناصر ان میں اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ ان کا الگ کرنا دُشوار ہے۔ اس امر پر اکثر مفکّرین متفق ہیں کہ تہذیب ایک نفسی میلان ہے اور زندگی کے اساسی اقدار کو متحقق کرنے کی کوشش سے تہذیب پیدا ہوتی ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ تہذیب انہی دو عناصر سے مرکّب ہے جو شہد کی مکھی کے چھتے میں پائے جاتے ہیں۔ اس چھتے میں موم بھی ہوتی ہے اور شہد بھی۔ موم کی بتی سے نور پیدا ہوتا ہے اور شہد سے شیرینی۔ کسی قوم کی تہذیب کو بس اس سے جانچنا چاہیئے کہ اس میں کس قدر عملی اور روحانی تنویر ہے۔ اور زندگی کی تلخیوں کے مقابلے میں اس نے کس قدر شیرینی پیدا کی ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ شیرینی کس طرح پیدا ہوتی ہے تو اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ وہ ذوقِ حسن سے اور جذبۂ محبت سے پیدا ہوتی ہے۔ علامہ اقبال بھی فرما گئے ہیں کہ بیابانِ طلب میں ذوقِ جمال ہمارا رہبر ہے۔ جہاں زندگی کا انداز اس قسم کا ہے کہ اس میں جمال آفرینی کا فقدان نظر آتا ہے،

وہاں تہذیب نہیں ہے۔ اور جہاں انسانوں میں باہمی ہمدردی کا جذبہ کم ہے اور نفسانفسی زیادہ، جہاں جابر مجبور و معذور پر بے کھٹکے ظلم کرتا ہے اور پھر بھی جماعت میں معزز شمار ہوتا ہے، وہاں تہذیب نہیں ہے۔ انسانی زندگی کا نصب العین جہل اور ظلم سے نجات حاصل کرنا ہے۔ جہل سے نجات علم کے ذریعے حاصل ہوتی ہے اور ظلم سے نجات محبت اور ہمدردی کی گہرائی اور اس کی توسیع سے۔ جہل اور ظلم سے نجات حقیقی نجات ہے جو انسان کو "لاخوف علیھم ولاھم یحزنون" کی معراج تک لے جاتی ہے۔ مختلف افراد مختلف میلانات لے کر پیدا ہوئے ہیں :

ہر کسے را بہر کارے ساختند میل وے اندر دلش انداختند

حدیث شریف میں ہے "فکلٌ میسر لما خُلق لہ" یعنی جو شخص جس انداز زندگی کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس کا حصول اس کے لئے آسان ہوتا ہے۔ میلانِ طبع کی وجہ سے اس کو وہ بات سہل معلوم ہوتی ہے جو دوسروں کو دشوار دکھائی دے۔ اچھی تہذیبیں وہ ہیں جن میں ہر فرد کو اپنے میلانات اور ممکنات کو معرضِ وجود میں لانے کے لئے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ کوئی انسان دوسرے انسان کا غلام نہ ہو۔ اور حصولِ علم اور حصولِ کمال کے راستے میں کوئی قوت اس کی مزاحم نہ ہو۔ وہ اپنے فکر میں بھی آزاد ہو اور اپنے عمل میں بھی جہاں تک کہ اس کا عمل دوسروں کی جائز آزادی کے منافی نہ ہو۔ حصولِ کمال کے لئے ضبطِ نفس کی بھی ضرورت ہے اور تسخیرِ فطرت کی بھی۔ کیونکہ فطرت کا جبر جہالت کی وجہ سے انسان کو بے بس بنا کر اس کی قوتوں کو مفلوج کر دیتا ہے۔ گویا تمام تہذیب کا مدار مکارمِ اخلاق پر ہے۔ بگڑے ہوئے اخلاق پر تہذیب کی کوئی پائدار تعمیر کھڑی نہیں ہو سکتی۔ یک طرفہ علمی ترقی جو اخلاقی اقدار سے معرا ہو وہ مفید ہونے کی بجائے بے حد مضر اور مہلک ہو سکتی ہے۔ اس کو عارف رومی نے ان دو اشعار میں بیان کر دیا ہے :

علم را بر تن زنی مارے شود علم را بر جاں زنی یارے شود

سامانِ حیات کی فراوانی کے لئے فقط زیرکی میں اضافہ کرتے چلے جانا اور توسیعِ محبت کی کوئی کوشش نہ کرنا انسان کے لئے محض ابلیسانہ میلانات پیدا کرتا ہے :

می شناسد ہر کہ از سرِ محرم است زیرکی از ابلیس و عشق از آدم است

تہذیب کے اس نصب العین کو ایک مسلمان دین بھی کہہ سکتا ہے۔ انفس و آفاق کے علم و معرفتِ حقائق کی لامتناہی کوشش کی تلقین قرآن میں بالتکرار ملتی ہے اور خدا جو انسان کا انتہائی نصب العین ہے اس کی وہ صفت جو کائنات کے ہر پہلو پر حاوی ہے رحمت ہے۔ اور انسان سے بھی خدا اس کا متقاضی ہے کہ

وہ "تخلقوا باخلاق اللہ" کی کوشش میں اس صفت کو زیادہ سے زیادہ اپنائے۔ لیکن چونکہ محبت کا جذبہ بے علمی کی وجہ سے بھٹک بھی سکتا ہے اور محبت اندھی بھی ہو سکتی ہے اس لئے محبت کو علم کی تنویر کی بھی ضرورت ہے۔ محبت اور معرفت ایک دوسرے کے معاون بھی ہیں اور ایک دوسری کی علت بھی۔ اور ایک دوسری کی معلول بھی۔ افلاطون نے اقدارِ حیات کا جائزہ لے کر یہ فیصلہ کیا کہ زندگی کے تین اساسی اقدار ہیں۔ (۱) حق (TRUTH)۔ (۲) حسن (BEAUTY)۔ (۳) خیر (GOODNESS) یا بالفاظِ دیگر صداقت، جمال اور نیکی۔ اس تثلیث میں ایک وحدت بھی ہے۔ سچائی بھی حسین معلوم ہوتی ہے اور حسن کے اندر بھی صداقت موجود ہے۔ اسی طرح صداقت نیکی کی طرف رہبری کرتی ہے اور نیکی سے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ تینوں ایک دوسرے کا آئینہ ہیں۔ حسن آئینۂ حق اور حق آئینۂ حسن۔ اسی طرح حق اور حسن خیر ہیں اور خیر میں صداقت بھی ہے اور حُسن بھی۔ تہذیب کا معیار انہیں اقدار سے متعین ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم ایسی ہے جس میں حق جوئی اور حق پژوہی نہیں۔ یا اس کے افراد میں ذوقِ جمال کی کمی ہے، جو نہ زندگی میں زینتیں پیدا کرتے ہیں اور نہ ان سے لطف اُٹھاتے ہیں۔ یا جو ملّت علم اور حسن آفرینی کی یک طرفہ اور محدود کوششوں میں محبت کے فقدان کی وجہ سے خیر طلب نہیں، تو سمجھ لیجئے کہ وہاں تہذیب نہیں ہے۔ ایسی تہذیب بقول علامہ اقبال جھوٹے نگوں کی چمک دمک اور ریزہ کاری ہے اور اس کے متعلق یہ خطرہ ہے کہ علم نے جو بے پناہ قوت اس کو عطا کی ہے اس کے غلط استعمال سے وہ اپنے ہی جگر میں خنجر بھونک کر خودکشی کر لے۔ مغربی تہذیب کا انجام اگر وہ عشق سے معرا رہی، اقبال کو یہی دکھائی دیا:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

مغرب کی جغرافیائی اور نسلی قوم پرستی نے، اپنی تمام مادی ترقیوں کے باوجود، ہمارے سامنے دو خوفناک جنگوں میں جہنّم کا نمونہ پیش کیا۔ یورپ کی ہر قوم دو صدیوں کی تسخیرِ فطرت کے نشے میں، اس اندازِ حیات میں ترقی کرتے ہوئے، عیش دوام کے خواب دیکھ رہی تھی کہ یک بیک ان کی بے اخلاق سیاست نے ان کے پرخچے اُڑا دیئے:

دیکھ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام وائے تمنائے خام، وائے تمنائے خام

اسی لئے امریکہ کے روحانی مصنّف ایمرسن نے بجا کہا ہے کہ اس قسم کی قوم پرستی کلچر کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ اور تہذیب اسی وقت قائم اور استوار ہوگی جب انسانوں کو اس طاغوت کی پرستش سے چھٹکارا حاصل ہوگا۔ حقیقی تہذیب توحیدِ انسانیت کے جذبے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر انسان

قوم ونسل ورنگ وزبان اور رسوم ورواج کے اختلاف کو باہمی خصومت کا سبب بنائے رکھیں تو انسان نہ دینی لحاظ سے موحد ہو سکتے ہیں اور نہ انسانوں کے روابط میں وحدت آفرینی کر سکتے ہیں۔ مرزا غالب بھی اس بارے میں ایمرسن کے ہم نوا ہو کر کہتے ہیں کہ جذبۂ قومیت کی کمی ایمان کی فراوانی کا باعث ہوتی ہے:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اس کے بعد ہم تمدّن یا سویلیزیشن کی طرف آتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس کے تضمن میں کیا کچھ آتا ہے۔ تمدّن کے لفظ کا مادہ بھی مدن یا شہریّت ہے اور سویلیزیشن کا مادہ بھی لاطینی میں سویٹاس یا شہر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ تمدن حقیقت میں وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں لوگ شہروں میں رہنے لگتے ہیں۔ شہری زندگی میں مختلف پیشے ہوتے ہیں اور تقسیم کار سے ہر کام اور ہر فن کو ترقی حاصل ہوتی ہے۔ روابط کی گوناگونی کچھ لذّتیں اور کچھ پیچیدگیاں پیدا کرتی ہے۔ رسوم ورواج ترقی کرتے کرتے منضبط قوانین کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ دولت اور سامانِ حیات میں افزونی ہوتی ہے۔ حرص وہوس ترقی کرتی ہے۔ جبر وتعدی سے حصول مال اور حصول اقتدار کا جذبہ نمایاں ہوتا ہے۔ علوم وفنون کی ترقی سے زینت کے سامان مہیا ہوتے ہیں۔ انسانی عقل بھی مدنیت ہی سے ترقی پاتی ہے۔ زندگی کی اُلجھنوں کو سلجھانے کے لئے عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پھر جب ایک مختصر طبقہ دوسروں کی محنت کی بدولت فکرِ روزگار سے آزاد اور فارغ البال ہوتا ہے تو ایسے مسائل کی طرف بھی توجہ کرتا ہے جن کا براہِ راست زندگی کی مادی ضرورتوں سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ علم محض مادّی افادیت سے شروع ہو کر آخر میں ایک حد تک آپ ہی اپنا مقصود بن جاتا ہے۔ لیکن وہ افادیت سے مطلقاً بے تعلق نہیں ہو سکتا۔ زندگی کی مادّی اور جسمانی آسائشوں اور آرائشوں کے لئے بھی قوانینِ فطرت کو سمجھنے اور ان کو مسخر کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ عقل انسانی روابط کے متعلق ہو یا فلک پیمائی کرے، شہری زندگی ہی کی پیداوار ہے۔ اس لئے مولانا روم فرماتے ہیں کہ گاؤں میں رہائش اختیار نہ کرنا ورنہ مدنیت سے بے تعلق ہو کر احمق ہو جاؤ گے:

دِہ مَرو دِہ مرد را احمق کنند

افلاطون کے ایک مکالمے میں ایک شخص سقراط سے پوچھتا ہے کہ تم ہمیشہ شہر ہی میں رہتے ہو باہر کیوں نہیں جاتے۔ اس نے جواب دیا کہ میں جس عقل کو ضروری سمجھتا ہوں وہ کھیتوں میں نہیں اُگتی۔ اور نہ درختوں پر لگتی ہے۔ فقط شہری زندگی کے روابط سے انسان کی فطرت کا علم حاصل ہوتا ہے اور انسان کے لئے ضروری علم اس کی اپنی فطرت ہی کا علم ہے۔ نہ کہ شجر وحجر کا علم۔

مختلف زمانوں میں مختلف اقوام نے مختلف اقسام کے تمدّن پیدا کئے ہیں۔ علوم وفنون، رسوم و رواج ذہنی اور مادی تخلیقات، سب کی معجون مرکب کا نام تمدّن ہے۔ کسی ایک اندازِ حیات پر زندگی بسر کرنے والی ایک جماعت کو عربی زبان اور قرآنی اصطلاح میں اُمت کہتے ہیں اور اُمتوں کی نسبت قرآنِ کریم نے ایک کلّی نظریہ بیان کیا ہے جس میں کوئی استثنا نہیں اور وہ یہ ہے کہ:

"ولکل امۃ اجل، اذاجاء اجلھم لا یستاخرون ولا یستقدمون"

فرد کی طرح ہر اُمت کی بھی ایک مدّتِ عمر ہے اس کے بعد اس کی موت آجاتی ہے

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے سب افراد یک بیک کسی حادثے میں فنا ہو جاتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ان کا پہلا اندازِ حیات اور نظامِ زندگی حیات آفریں نہیں رہتا۔ ان کی زندگی میں ایسا انقلاب ہوتا ہے کہ شعبۂ حیات یا تو مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے یا اس کی صورت بدل جاتی ہے۔ اس تبدیلی میں کبھی تو اُمت تغیرِ احوال سے مطابقت پیدا کر کے پہلے سے بہتر حالت میں آجاتی ہے۔ اور کبھی جمود و ہٹ دھرمی یا بد اخلاقی کی وجہ سے مغلوب، بے بس اور پس ماندہ ہو جاتی ہے۔ پُرانے طریقے جو دیر تک فائدہ بخش رہے اندرونی اور بیرونی تغیرات کی وجہ سے ضرر رساں ہو جاتے ہیں۔ اس حقیقت کو انگریز شاعر ٹینی سن نے نہایت عمدگی سے چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے:

Old order changeth, yielding place to new,
And God fulfils Himself in many ways:
Lest one good custom should corrupt the world.

ہر قوم کے تمدن میں عروج کی حالت میں بھی کچھ خوبیاں ہوتی ہیں اور کچھ خرابیاں۔ مشہور المانوی فلسفی ہیگل اور ہمارے حکیم شاعر غالبؔ دونوں نے حیاتِ انسانی کا ایک قانون بیان کیا ہے کہ تخریب تعمیر کے بعد ہی نہیں آتی بلکہ ہر تعمیر میں اور ہر نظامِ حیات میں ابتدا ہی سے تخریب کا سامان بھی مضمر ہوتا ہے جو ایک خاص مدّت کے بعد نمایاں ہو کر تعمیر و ترکیب پر غالب آجاتا ہے:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اسی خیال کو اقبال نے ذرا بدل کر اس شعر میں ادا کیا ہے:

دیکھ لوگے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل موجِ مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی

آئیے اس زاویۂ نگاہ سے مسلمانوں کی تہذیب اور ان کے تمدّن پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔ ایک زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی تہذیب بھی دیگر اقوام سے بہتر تھی اور ان کا تمدّن بھی زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ ان کے اخلاق

بحیثیت مجموعی دیگر اقوام سے اچھے تھے۔ ان کے قوانین عادلانہ تھے۔ وہ دیگر اقوام اور ادیان کے ساتھ رواداری کا سلوک کرتے تھے۔ وہ ہر قسم کے علم کے شائق تھے۔ سینٹ پال کا ڈین اور مشہور مفکر و مصنف تھیوکریسز یعنی دینی حکومتوں پر ایک مضمون لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ عام طور پر تاریخ میں یہی دکھائی دیتا ہے کہ دینی حکومتیں حصولِ علم سے گریز کرتی ہیں مگر مسلمانوں کی حکومتیں جو اپنی بنیاد دینی قرار دیتی تھیں، اس کلیہ سے مستثنیٰ نظر آتی ہیں۔ ان لوگوں کو علم کی بھوک اور پیاس ایسی شدید تھی جس کی مثال دوسری جگہ نہیں ملتی۔ لیکن کوئی چھ صدیوں کے علمی اور فنی عروج کے بعد اس اُمت کو بھی زوال آیا۔ اس کے عروج و زوال کے اسباب پر ابھی تک دنیا کے مفکرین متفق نہیں ہیں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ تاتاریوں کی غارت گری کے بعد مسلمان تہذیب و تمدن میں اپنا کمال اور اپنی خلاقی کھو بیٹھے۔ چودھویں صدی عیسوی کے قریب فرنگ میں زندگی نے ایک کروٹ لی۔ مسلمان سوتے گئے اور اغیار بیدار ہوتے گئے۔ خود فرنگی اب اس کا اقرار کرنے لگے ہیں کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ سے قبل مسلمان یورپ کے اُستاد تھے۔ لیکن ان اُستادوں کو کیوں سانپ سونگھ گیا۔ اس کا جواب آسان نہیں۔ ہمارے دیئے سے یورپ نے اپنا دیا جلایا۔ مگر دوسرے کا دیا جلاتے ہوئے ہمارا دیا بجھ گیا:

بجھ کے شمعِ ملتِ بیضا پریشاں کر گئی — اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی
دورِ گردوں میں نمونے سینکڑوں تہذیب کے — پل کے نکلے مادرِ ایام کی آغوش سے

امریکہ کا مشہور خطیب اور مصنف انگرسول اپنے ایک ایڈریس میں کہتا ہے:

Civilization was first in the brain of Europe on the point of a Moorish lance.

یعنی مسلمانوں نے یورپ کو مار مار کر مہذب بنایا۔ مگر اب پدرم سلطان بود کے دعوے بے محل اور سعی خراش معلوم ہوتے ہیں:

تھے تو آبا وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو — ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

اکبر الہ آبادی کہتے ہیں:

رہی رات ایشیا غفلت میں سوتی — نظر یورپ کی کام اپنا کیا کی
ابھی ایجن گیا ہے اس طرف سے — کہے دیتی ہے تاریکی ہوا کی

جیسے میں پہلے عرض کر چکا ہوں مسلمانوں کی تہذیب اور تمدن میں اچھے دور میں بھی خوبیاں ہی خوبیاں نہ تھیں۔ اس میں طرح طرح کی خرابیاں بھی موجود تھیں۔ اسلام کا قائم کردہ اور تلقین کردہ

جمہوری نظام جلد ہی ملوکیت سے بدل گیا اور "لاقیصر ولاکسریٰ" کہنے والی اُمت کے حکمرانوں نے تمام پہلے قیصروں، کسراؤں اور فرعونوں کو شان و شکوہ و مطلق العنانی میں مات کر دیا۔ اسلام بتدریج غلامی کی لعنت کو صفحۂ ہستی سے ملیا میٹ کرنا چاہتا تھا۔ مسلمانوں نے اس کی صورت کو کسی قدر بہتر تو بنا دیا لیکن اس کا صفایا کرنے کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ سلاطین کی مطلق العنانی کو تقدیرِ الٰہی سمجھ کر اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اور جاہل و ظالم سلطان بھی ظل اللہ بن گئے۔ سوشل ڈیموکریسی ان کے ہاں اسلام کی تعلیم مساوات و اخوت کی بدولت دوسروں سے بہتر رہی لیکن پولٹیکل ڈیموکریسی اور معاشی عدل کی طرف کسی نے رُخ نہ کیا۔ ان تمام کوتاہیوں کے باوجود وہ ایک عرصۂ دراز تک دوسری قوموں سے پیش پیش رہے۔ اس لئے کہ دوسری اقوام پر ان سے بہت زیادہ دین اور دنیا کی ظلمتیں چھائی ہوئی تھیں۔ خدا خدا کر کے طویل خفتگی کے بعد اب بیداری کے آثار نمایاں ہیں۔ انیسویں صدی میں مغربی اقوام کے غلبے نے ان کو وہ ٹھوکریں لگائیں کہ ان کی آنکھیں کھلنے لگیں:

ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں — سرمۂ چشمِ دشت میں گردِ رم آہو ہوا

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق! ہماری موجودہ نسل کو اب کیا کرنا چاہیئے۔ سب سے پہلے ہمارا فرض ہے کہ ہم اسلام کی روشنی میں تہذیب کا نصب العین معین کریں اور مہذب انسان کا جسے اقبال مردِ مومن کہتا ہے کوئی واضح نقشہ اپنے ذہن میں مرتب کریں۔ ہم رحمان کے بندے اور رحمۃ اللعالمین کی اُمت ہیں۔ ہمیں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں عدل و رحمت کو صورت پذیر کرنا ہے۔ حریت، اخوت، مساوات، آزادی، برادری اور برابری کو مسلسل ترقی دینا ہماری سیاسی، معاشی اور اخلاقی زندگی کا لائحہ عمل ہونا چاہیئے۔ ہمیں تہذیب کے بنیادی عناصر کو کسی غیر سے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہماری خفتگی کے زمانے میں اگر دیگر اقوام نے اپنی جدوجہد سے ان اقدار کو ہم سے بہتر متحقق کیا ہو تو ہمیں ان سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں بہت سے علوم و فنون دیگر اقوام سے حاصل کئے اور پھر ان کو اپنی مخصوص ثقافت کے خم میں غوطہ دے کر ان کے رنگ کو نکھار دیا۔ اس دورِ زریں میں کسی نے یہ ہتک محسوس نہ کی کہ میں دیگر اقوام سے علم حاصل کروں۔ اب بھی کوئی وجہ نہیں کہ ہم دوسروں سے ترقی یافتہ علوم کو حاصل نہ کریں۔ ہم تو اس رسولؐ کی اُمت ہیں جس نے کہا کہ علم حاصل کرو خواہ تمہیں چین جانا پڑے۔ حالانکہ اس وقت چین میں مسلمان تو بستے نہیں تھے۔ اور اسلام سیکھنے کے لئے ہمیں وہاں جانے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر تمام علم صرف علمِ دین ہی نہیں۔ خود رسول کریمؐ نے فرمایا "العلم علمان علم الابدان وعلم الادیان"۔ اب ہمیں ایک طرف یہ ضرورت ہے کہ ہم اپنی ملت کے نفوس میں سے احساسِ کہتری کو زائل کریں جو غلبۂ فرنگ نے ہم میں پیدا کر دیا اور اپنے بزرگوں کے ان کارناموں کو سامنے لائیں جن کی بدولت انسانیت کی

ثروتِ فکر میں اضافہ ہوا۔ خوبیوں کو اُجاگر کریں اور خرابیوں سے عبرت حاصل کریں۔ علوم وفنون کے حصول کی وہی پیاس پیدا کریں جو ہماری ملت کا شیوہ تھی۔ معاشی عدل میں دیگر اقوام نے جو اچھے تجربے کئے ہیں ان کو دیکھ کر اپنی معاشی حالت درست کریں۔ کیونکہ اسلام کا ایک عظیم مقصد معاشی عدل کا قیام تھا۔

اسلام جن صداقتوں کے مجموعے کا نام ہے ان کے عناصر قبلِ اسلام بھی دنیا کی مختلف اقوام میں منتشر تھے۔ اسلام نے انقلابی بات یہ کی کہ ان عناصر سے ایک نیا جاں پرور مرکب بنایا اور اس میں اپنی روح پھونکی۔ اس وقت مسلمانوں کو اپنے ثقافتی احیاء کے لئے پھر یہی کچھ کرنا ہے۔ جو قومیں علوم وفنون اور معاشرتی اور سیاسی تنظیم میں ہم سے بہت آگے نکل گئی ہیں ہمیں بے دریغ ان سے سیکھنا چاہیئے۔ زندگی کی صداقتیں اور اس کی خوبیاں کسی ایک قوم کا اجارہ نہیں۔ روحِ اسلامی یہ ہے کہ فراخ دلی سے ہر ایک سے اور ہر جگہ سے افکار واعمال کے اچھے نمونے جمع کئے جائیں، خواہ وہ اپنی قوم کے افراد میں ملیں اور خواہ دیگر قوم کے افراد میں۔ اسلامی ثقافت کی عالمگیری یہی ہے کہ وہ شرق وغرب اور امتیازِ اقوام سے بالاتر ہے۔ علم اور اچھی ثقافت کا ہر پہلو مسلمان کا گم شدہ مال ہے۔ روحِ اسلام میں ایسے میلانات اور ممکنات موجود ہیں کہ مسلمان اگر اپنی خودی کو کھوئے بغیر چاروں طرف سے فیض حاصل کریں تو یہ ملت دوبارہ اعلیٰ درجے کی ثقافت کے نمونے پیش کر سکتی ہے۔ لیکن جمود وتقلید سے نکل کر تحقیق کی طرف آئے بغیر نشاۃ ثانیہ اور وقارِ ملت قائم نہیں ہو سکتا۔ محض نقالی زندگی کا ثبوت نہیں۔ دنیا میں اب فقط دعووں کو کوئی نہیں مانتا۔ اور نہ کوئی مدعیان بلند بانگ کو عزت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ہم محض اچھے ثقافتی نصب العین کا نقشہ کھینچ کر دوسروں کی نظر میں معزز نہیں بن سکتے۔ یہاں مجھے مولانا عبیداللہ سندھی مشہور انقلاب پسند، کی بیان کردہ ایک بات یاد آگئی جو قابلِ بیان ہے۔ مولانا فرماتے تھے کہ میں ماسکو میں اسٹالین سے ملا اور اس کے سامنے نصب العینی اسلامی تہذیب وتمدن کا نقشہ پیش کیا۔ جب اپنی تقریر ختم کر چکا تو اسٹالین نے پوچھا کہ کون سی قوم اس نقشے کے مطابق زندگی بسر کر رہی ہے۔ میں نے کہا کہ اس وقت تو کوئی قوم بھی اس نقشہ پر اپنی زندگی کو نہیں ڈھال رہی۔ تو اس نے مختصراً یہ جواب دیا کہ جب کوئی قوم اس پر کاربند ہوگی اور اس کا تجربہ ہو جائے گا تو پھر ہم دیکھیں گے کہ اس سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ مولانا یہ جواب سُن کر ٹھنڈے ہو گئے۔

ملت اسلامیہ کی خودی اگر فنا نہیں ہو گئی اور مسلمان فقدانِ عشق یا محرومیٔ جذبۂ حیات سے راکھ کا ڈھیر نہیں بن گیا ہے تو وہ دنیا کے علوم وفنون کو سمیٹ کر تحقیق واجتہاد سے انہیں روحِ اسلامی پھونک کر پھر ایک ایسا نمونہ پیش کرے جس سے اس وقت شرق بھی محروم ہے اور غرب بھی۔ اسلام کسی ایک زمانے کی تہذیب اور اس کے تمدن کا نام نہیں۔ یہ نمونے اسلامی اقوام میں بدلتے چلے آئے ہیں اور ہمیشہ بدلتے رہیں گے۔ زندگی کی مسابقت میں ہم کسی پہلے نقشے کو واپس نہیں

لا سکتے۔ زندگی کہیں اپنے آپ کو دُھراتی نہیں۔ صوفیہ کا مقولہ کہ تجلّی میں تکرار نہیں یا قرآن کریم کا ارشاد کہ "کل یوم ھو فی شان" تمام تاریخ انسانی پر عائد ہوتا ہے۔ یکرنگی، تکرار اور اعادہ جمادات کی صفت ہے۔ زندگی کا شیوہ نہیں۔ پانی آج بھی وہی ہے جو آدمِ اوّل کے زمانے میں تھا۔ بلکہ کروڑوں سال پیشتر جب ہائیڈروجن اور آکسیجن کی کیمیائی ترکیب نے پانی بنایا تھا۔ اس وقت بھی ہم وہی پانی پیتے اور برتتے ہیں۔ لیکن پانی بھی جو ایک بار ندی میں بہ گیا وہی پانی پلٹ کر پھر کبھی واپس نہیں آتا۔ یونان میں فلسفۂ تغیر کے امام ہیراقلیتوس کا قول ہے کہ کوئی شخص بہتی ندی میں ایک ہی پانی میں دو غوطے نہیں لگا سکتا۔ ہمارا نہ صرف اپنے ماضی بلکہ تمام نوعِ انسان کے ماضی سے ایک رشتہ ہے۔ یہ تمام ماضی شعوری اور غیر شعوری دونوں طرح سے ہماری زندگیوں پر اثر انداز ہے۔ اس ماضی کے کچھ عناصر ابدی حقائق تھے جو اپنی ماہیت میں غیر متغیر ہوتے ہیں، جن کی نسبت قرآن "لا تبدیل لخلق اللہ" کہہ کر ان کو دینِ قیم قرار دیتا ہے۔ لیکن ایک ہی معنی لاتعداد صورتیں اختیار کرتا ہے۔ صورت پرستی ایک قسم کا شرک ہے اس لئے موحد وہی ہے جس کا صبح و شام کا ورد یہ ہو کہ "صورت نہ پرستم من" زندہ قومیں اپنے ماضی سے اپنا رشتہ قائم رکھتے ہوئے اپنے حال کے متعلق اجتہاد برتتی ہیں اور جب حیات اپنے ارتقاء کے لئے کسی تغیرِ صورت کی متقاضی ہوتی ہے تو وہ محض روایات کی لکیر نہیں پیٹتیں۔ انسان کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں اور ایک تعریف یہ ہے کہ وہ آگے اور پیچھے دیکھنے والی مخلوق ہے۔ آپ ماضی کو مطلقاً نظر انداز کر کے نہ اپنا حال درست کر سکتے ہیں اور نہ اپنے مستقبل کے لئے صحیح راہیں ڈھونڈھ سکتے ہیں۔ لیکن ماضی سے فیض حاصل کرنا اور بات ہے اور ماضی پرستی دوسری چیز ہے۔ محض ماضی پرستی ایک طرح سے مردہ پرستی ہے۔ تقاضائے تجدیدِ حیات میں ہم صرف عظمتِ رفتہ کے مقابر کے مجاور بن کر کوئی زندگی پیدا نہیں کر سکتے۔ "ما وجدنا علیہ آبائنا" منکروں اور کافروں کا شیوہ ہے۔ حضرت نقشبند علیہ الرحمۃ کیا خوب فرما گئے ہیں:

تا کے بہ زیارتِ مقابر عمرے گزرانی اے فسردہ
یک گریۂ زندہ پیشِ عارف بہتر از ہزار شیرِ مُردہ

صرف زندہ قومیں اپنے ماضی سے حیات افروز سبق حاصل کر سکتی ہیں۔ زمانے کے ساز بدلے گئے۔ اس کے انداز بدلے گئے۔ قدیم زمانوں میں زندگی کے مسائل بعینہٖ وہ نہ تھے جو آج ہیں، اس لئے ان کا حل بھی جوں کا توں کسی پہلے نقشے کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ زمانہ بھی ایک صحیفہ ہے جو اپنی آیات کو منسوخ کرتا رہتا ہے، لیکن قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق کوئی طریقِ عمل یا اصولِ کار منسوخ نہیں ہوتا جب تک کہ اس سے کسی قدر مشابہ یا اس سے بہتر اصول ظہور میں نہیں آتا۔ گویا از روئے قرآن عملِ تنسیخ عملِ ارتقا ہے۔ کسی دَور میں مسلمانوں کی ثقافت کیا تھی اس کا اچھی طرح مطالعہ کیجئے۔ اس کے حسن و قبح پر غور کیجئے۔ اس میں سے لازوال جواہر کو خس و خاشاک سے الگ اور صاف کر کے از سرِ نو تراشئے، تاکہ ترشے ہوئے ہیرے کی طرح اس کے ہر پہلو سے نئے رنگ کی شعاعیں نکلیں، لیکن یہ کبھی نہ بھولئے کہ تجلّی میں تکرار نہیں۔ مختلف ادوار میں اسلامی

اقوام کی ثقافت نے کئی رنگ بدلے ہیں اور ہر جگہ اسلام کی ان عناصر سے آمیزش ہوئی ہے جو کسی قوم کی تاریخ یا اس کے جغرافیہ اور مادّی وسائل کی پیداوار تھے۔ آیندہ بھی یہی ہوگا۔ جسے اسلامی ثقافت کہتے ہیں اسے مسلمان اقوام کی ثقافت کہنا چاہیئے، جو نہ کبھی یک رنگ رہی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ آج اگر انگریزی قوم مسلمان ہو جائے تو اس کی ثقافت نہ قدیم حجازی ہوگی اور نہ جدید حجازی، جس میں ابھی تک غلامی ملیامیٹ نہیں ہوئی۔ چینی مسلمان کی ثقافت افریقہ کے نیم وحشی مسلمان کی ثقافت سے جُدا ہی رہے گی۔

"چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا" الاپنے کے باوجود چین اور عرب اور ہندوستان اسلام میں آکر بھی یک رنگ نہیں ہو سکے۔ اور نہ ہی انہیں ہونا چاہیئے۔ اختلاف الوان والسنہ کو قرآن نے آیاتِ الٰہی قرار دیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی وحدت کثرت آفرین بھی ہے اور تنوع پسند بھی۔ اسی طرح تمام زندگی قدیم عناصر کو برقرار رکھتے ہوئے بھی جدّت آفرین ہے۔ اسلامی ثقافت کہیئے یا مسلمانوں کی ثقافت اس میں ابداً گوناگونی پیدا ہوتی رہے گی۔ ثقافت کا کوئی ایک نقشہ ہمیشہ کے لئے قائم نہیں رہ سکتا۔ مسلمانوں کو اپنی نشاۃ ثانیہ میں ماضی، حال اور مستقبل کا رشتہ قائم رکھنا ہے، لیکن کورانہ تقلید سے گریز لازمی ہے۔ اقبال کی آرزو ہے:

طرحِ نو افگن کہ ما جدّت پسند افتادہ ایم ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

اور غالب اسی جذبے کے ماتحت دو بلیغ اشعار کہہ گیا ہے:

رفتم کہ خونگی ز تماشا برا فگنم در بزمِ رنگ و بو نمطے دیگر افگنم

اور دوسرا شعر غالب کے بھوپالی نسخے میں ہے۔

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا